ترجمہ وتلخیص: فدا محمد عدیل (تیسری قسط)

گوانتاناموبے میں کیا قیامت ڈھائی جارہی ہے؟

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف
امریکی عقوبت خانے میں گزرے لہورنگ شب وروز کی دل گداز روداد بیان کررہے ہیں

یکم جولائی ۲۰۰۲ء کی شام بہت زیادہ تعداد میں امریکی فوجی آئے اور ہم میں سے آٹھ افراد کو قطار میں کھڑا کر کے سروں پر کالے تھیلے چڑھائے گئے، کانوں میں روئی ٹھونسی گئی اور ہاتھ باندھے گئے۔ ہم آٹھ افراد کو ایک دوسرے کمرے میں منتقل کردیا گیا، جہاں ہمارے کپڑے اتارے گئے اور ہماری برہنہ فوٹو گرافی شروع ہوئی۔ اس کے بعد سرخ رنگ کے کپڑے اور سرخ بوٹ پہنائے گئے، ہاتھ اور پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ ہتھکڑیاں ایسی سخت تھیں کہ ہم اپنے ہاتھوں کو حرکت تک نہ دے سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمیں مار مار کر اور دھکے دے دے کر جہاز میں سوار کرایا گیا جہاں ہم سب کو ایک مشترکہ زنجیر سے باندھ کر اس کو تالا لگا دیا گیا۔ زنجیر کو اس قدر کس کے باندھا گیا تھا کہ کوئی بھی ساتھی حرکت نہ کرسکتا تھا، نہ آگے نہ پیچھے، نہ دائیں نہ بائیں۔ ایک نئے عذاب نے ہمیں گھیر لیا۔ جہاز نے اڑان بھری، ہر قیدی کے سامنے دو فوجی کھڑے ہوگئے۔ وقت گزارنے کے ساتھ قیدیوں کی فریاد بھی بڑھتی گئی۔ میرے ساتھ ہی بندھے خیر اللہ خیر خواہ (سابق گورنر ہرات) نے کئی بار ہاتھوں میں تکلیف کی شکایت کی مگر بے سود۔ میں بھی سخت اذیت سے دوچار تھا۔ کمر ٹوٹتی محسوس ہورہی تھی، پاؤں میں اتنا شدید درد تھا جیسے کاٹے گئے ہوں۔ شکایت اس لیے نہیں کرسکتا تھا کہ قصائی کو کون ڈاکٹر سمجھتا ہے؟ کچھ دیر بعد بہت سے ساتھیوں نے تکلیف کے مارے باقاعدہ رونا شروع کردیا۔ جیسے ہر کوئی نزع کی حالت میں ہو۔ ہمیں پرواز سے چار گھنٹے قبل جہاز میں باندھا گیا تھا۔ تین گھنٹے جہاز اترنے کے بعد رکھا گیا جبکہ بیس گھنٹے کی مسافت تھی۔ اس طرح جہاز سے قید خانے تک ہم نے جو وقت لیا، وہ کل ملا کر ۳۰ گھنٹے بنتا ہے۔ ہم ۳۰ گھنٹے زندگی کے سخت ترین عذاب سے گزرے۔ ہمیں توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کڑے وقت کی جزا اپنی رضا کی صورت میں ضرور عطا فرمائے گا۔ قندھار سے گوانتاناموبے تک ہر قیدی کو صرف ایک گلاس پانی اور ایک عدد سیب دیا گیا۔ شاباش انسانی حقوق کے علمبردارو! ۳۰ گھنٹے اور ایک گلاس پانی اور ایک سیب؟ اس سے اندازہ لگائیے کہ انسانیت کا کتنا احترام ہے امریکی دلوں میں۔ میں نے سیب کو ہاتھ لگایا نہ پانی کو۔ اوّل تو ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، دوم اگر میں کچھ کھاتا پیتا تو پیشاب کی صورت میں ایک نئے عذاب سے گزرنا پڑتا۔ ہم سب کے ہاتھ پاؤں سوج گئے۔ دس بارہ گھنٹے بعد تو بالکل بے حس ہوگئے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہاتھ پاؤں میں چبھ گئی تھیں، جن کو اتارتے وقت امریکیوں کو بھی دقت ہوئی۔ دورانِ سفر جہاز کچھ وقفے کے لیے ایک جگہ اترا بھی تھا مگر ہمیں پتا نہیں چلا کہ وہ کونسی جگہ تھی۔

ہمیں جہاز سے ایک ایک کرکے اتارا گیا۔ پھر ایک دوسرے کے پیچھے باندھ کر گاڑیوں میں ٹھونسا گیا۔ انگلش اور عربی زبانوں میں حرکت نہ کرنے کا حکم بار بار سنایا جاتا۔ کوئی حرکت کرتا تو زوردار لات اس کا مقدر بن جاتی۔ میں نے بھی

متعدد لاتیں کھائیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں کی سوجن ایک مہینے تک برقرار رہی جبکہ تین مہینے تک ہاتھ پاؤں ایسے محسوس ہوتے تھے جیسے شل ہو چکے ہوں۔ ہم سب کو گاڑیوں سے اتارا گیا اور سیدھا ایک کلینک لے جایا گیا جہاں سارے قیدیوں کے ایکسرے کرائے گئے۔ پھر ایک تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا۔ میری باری آئی تو پہلے مجھے اس کمرے میں باندھا گیا، کچھ دیر بعد ایک شخص آیا جو فارسی بولتا تھا۔ اس نے پوچھا کیسے ہو؟ میرا نام ٹام ہے، مجھے یہاں تفتیش پر مامور کیا گیا ہے۔ میں سخت تھکا ہوا تھا، بات نہ کر سکتا تھا۔ صرف اتنا کہا کہ میں بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا پھر دیکھیں گے مگر اس کا بات کرنے کا اصرار بڑھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ پہلے میں گوانتاناموبے بھیجے جانے سے ڈرتا تھا، اب ڈر کا ہے کا؟ بلکہ اب تو میں موت کو اپنی زندگی پر ترجیح دیتا تھا۔ ٹام جتنا اصرار کرتا اتنا ہی میں سخت ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد فوجی آئے اور مجھے روانہ کر دیا۔ ہم سب قیدیوں کو اس قید خانے لے جایا گیا جو آہنی کنٹینر سے بنایا گیا تھا۔ یہاں ہمارے ہاتھ پاؤں کھولے گئے۔ ایک فوجی آیا اور قیدیوں کو پہلے سے تیار کیا گیا، کھانا دیا۔ یہاں خوشی کی بات یہ تھی کہ پانچ مہینے کے بعد پانی ملا جس سے ہم وضو کر سکیں۔ میں نے جلدی جلدی وضو بنایا، نماز پڑھی اور سو گیا۔ کچھ دیر سویا تھا کہ قیدیوں کی آواز سے جاگا جو بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ رات لمبی ہو گئی تھی۔ کچھ بھائیوں نے کہا کہ یہاں دھوپ نہیں نکلے گی، کسی نے خیال ظاہر کیا کہ یہاں رات ۱۸ گھنٹے کی ہو گی۔ حقیقت کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ میں پھر سو گیا، تہجد کے لیے بھی نہ اٹھا۔ فجر کی نماز تک گہری نیند سوتا رہا، نہ فوجیوں کی آواز تھی اور نہ کتوں کے بھونکنے کی۔ صبح ہوئی، نماز پڑھی پھر گپ شپ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اندر بلاک میں باتوں پر پابندی نہ تھی اور فوجیوں کا رویہ باگرام اور قندھار میں متعین فوجیوں سے بہتر تھا۔ نسبتاً آزادی تھی مگر یہ آزادی قفس کے اندر تھی۔ ہر قید خانے کی لمبائی چھے فٹ اور اونچائی ساڑھے چار فٹ تھی۔ جستی چادر کی ایک شیٹ قید خانے کے درمیان میں ویلڈ کی گئی تھی جو چارپائی کا کام دیتی تھی۔ بیت الخلاء قید خانے کے اندر ہی بنایا گیا تھا، گویا نیند، خوراک، نماز اور رفع حاجت ساری ضرورتیں اتنی سی مختصر جگہ میں پوری کرنی ہوتی تھیں۔ اس جگہ کو آپ پنجرے کا نام دے سکتے ہیں۔ دو پنجروں کے مابین آہنی جالیاں تھیں، رفع حاجت کے وقت بہت مشکل پیش آتی تھی۔ کوشش ہماری یہ ہوتی کہ ایک دوسرے سے پردہ کر سکیں۔ ہم جس پرواز میں آئے تھے اس میں ۷ افغانی بھائی تھے جبکہ باقی عرب تھے۔ ان میں خیر اللہ خیر خواہ، حاجی محمد صراف، مولوی محمد رحیم مسلم دوست، بدر الزمان، سنگین خیر اللہ اور دوسرے بھائی جن کے نام اب یاد نہیں شامل تھے۔ ساتھی کہتے کہ یہ گوانتاناموبے نہیں عرب کا کوئی جزیرہ ہے کیونکہ آب وہوا عرب ممالک کی طرح ہے۔ ہمیں قبلے کی سمت کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ عرب بھائی امریکیوں کے ہر قول وفعل پر شک کیا کرتے تھے۔ بعض قیدیوں کو شک تھا کہ پہرے پر مامور فوجی امریکی نہیں، عرب ہیں۔ اسی لیے وہ ان فوجیوں کے سامنے عربی میں بات نہیں کیا کرتے تھے تاکہ ان کے راز افشاں نہ ہوں۔ کبھی کبھی ان فوجیوں کے منہ سے بھی عربی الفاظ نکلتے تھے۔ مثلاً جب کسی قیدی کے سامنے آتے تو کہتے ''کیف حالک؟''

گوانتاناموبے کا پہلا کیمپ:

ہمیں گوانتاناموبے میں پہلی دفعہ جس کیمپ لے جایا گیا، اس کے ۸ بلاک تھے۔ ہر بلاک میں ۴۸ قیدیوں کو رکھا جاتا۔ دو پھرنے یعنی واک کی جگہیں اور ۴ باتھ روم بھی تھے۔ یہ سارے بلاک لوہے کے بنائے گئے تھے، چھت اور فرش بھی

آہنی تھے اور دیواریں بھی۔ دیوار میں ایک چھوٹا سوراخ ہوتا تھا جس سے ہمیں کھانا دیا جاتا تھا۔ یہ سوراخ صرف کھانے کے وقت ہی کھلتا۔ یہاں کے فوجی انتہائی بداخلاق تھے۔ قیدیوں کو انتہائی کم کھانا دیتے تھے۔ ایک بلاک کے قیدی دوسرے بلاک کے قیدیوں سے بات چیت نہ کر سکتے تھے۔ سرخ رنگ کے موٹے اور کھردرے کپڑے پہننے کے لیے دیئے جاتے۔ زیر جامہ کچھ نہ تھا جس کی وجہ سے بہت سے قیدیوں کی جلد خراب ہوگئی تھی۔ ہر قیدی کے لیے کوٹھڑی نما کمرہ مخصوص تھا جس میں دو پتلے بستر، ایک چھوٹی پلاسٹک شیٹ، ایک ٹوتھ برش اور قرآن مجید کا ایک نسخہ پڑا ہوتا۔ کوئی قیدی سزاوار ہوتا تو صرف پلاسٹک کی شیٹ اس کے پاس رہنے دی جاتی تھی، باقی چیزیں لے لی جاتیں۔ قیدیوں کا زیادہ تر وقت سزا میں گزرتا۔ بعد میں دوسرا کیمپ بھی بنا۔ جنرل بدل گئے جس سے شرائط میں بھی تبدیلیاں آ گئیں۔ سختیاں بڑھ گئیں اور تین مزید بلاک قائم کیے گئے، مذہبی کتابیں لے لی گئیں، روزانہ حجامت کی جانے لگی، قیدیوں کو چار کیٹگریز میں تقسیم کر دیا گیا۔ سب سے سخت شرائط والا درجہ چوتھا تھا۔ اس درجے والے قیدیوں کو صرف پلاسٹک کی ایک شیٹ دی جاتی تھی جو سردی سے بچاؤ کے لیے ناکافی تھی۔ ارزگان کے رہنے والے ملا عبدالغفور میرے پڑوسی تھے، ہر وقت سزاوار رہتے۔ امریکی تعصب ان کے لیے دن بدن بڑھتا رہا۔ وہ آخر کار اتنا تنگ آ گئے کہ جب بھی کوئی امریکی فوجی نظر آتا تو گلے پر ذبح کرنے کے انداز میں انگلی پھیر کر اپنے انداز میں امریکی فوجی کو ذبح کرنے کی دھمکی دیتے اور ہر وقت انتقام لینے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ امریکی ترجمانوں کو بھی برا بھلا کہتے تھے۔ میں ان کو بہت سمجھاتا تھا اور سزا سے ڈراتا تھا لیکن وہ نہ مانتے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کی شہادت کی خبر ملی۔ اسی طرح میری گوانتاناموبے میں موجودگی کے دوران قندھار کے ملا شہزادہ کی شہادت کی خبر بھی ملی جن کو رہا کیا جاتا تو وہ افغانستان واپسی پر پھر امریکیوں کے خلاف لڑنا شروع کر دیتے اور پھر گرفتار ہو کر یہاں پہنچ جاتے۔

قرآن رکھنے کی سزا

گوانتاناموبے میں قرآن کریم کے بے حرمتی معمول بن گیا تھا۔ امریکیوں کو بھی پتا تھا کہ مسلمان قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہماری ۸۰ فیصد سزاؤں کا موجب قرآن کریم ہی تھا۔ وہ بار بار قرآن کریم کی بے حرمتی کرتے اور قیدی ہر بار غیرت ایمانی کا مظاہرہ کر کے اپنے اپنے انداز میں اس پر احتجاج کرتے اور سزا پاتے۔ ہم کہتے کہ قرآن کریم کے بدلے کوئی دوسرا مذہبی لٹریچر دے دو مگر امریکی فوجی حکام ایسا نہ کرتے کیونکہ قیدیوں کو سزائیں دینے کا ان کے پاس قرآن کریم کی صورت میں بہانہ موجود تھا۔ کوئی قیدی قرآن کریم اپنے پاس رکھتا تو بھی اس کو سزا دی جاتی تھی، نہ رکھتا پھر بھی سزاوار ہوتا۔ ارزگان کے رہائشی عبداللہ جن کا اصل نام خیراللہ تھا اور خیراللہ خیرخواہ کے نام سے گرفتار کر کے گوانتاناموبے پہنچایا گیا تھا' نے وہاں سے رہائی کے بعد مجھے بتایا کہ جب اس کو قندھار میں رکھا گیا تو ہر روز قیدی کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ زمین پر الٹا لٹا کر میری تلاشی لی گئی اور پاکٹ سائز قرآن مجید کا نسخہ لے کر ورق ورق کر کے پھاڑا گیا اور زمین پر پھینک دیا۔ پھر امریکی فوجیوں کے کتے آئے اور قرآنی اوراق کو منہ میں پکڑا۔ یہ دل خراش منظر دیکھ کر میں بے اختیار کہہ اٹھا کہ اے کلام الٰہی! تیرا کیا گناہ ہے تو تو دہشت گرد نہیں ہے؟ سعودی عرب کے شاکر کہتے کہ تفتیش کار اکثر تفتیش کرتے وقت قرآن کریم کا نسخہ نیچے اپنے پاؤں کے پاس رکھتا اور مجھے اس خوف سے سچ سچ بولنا پڑتا کہ یہ بدبخت میری کسی جھوٹی بات پر قرآن مجید پر پاؤں نہ رکھ دے۔

دوسرا اور تیسرا کیمپ:

میں سال ۲۰۰۳ء تک ڈیلٹا کیمپ کے بلاک نمبر ۱۵ گولڈ بلاک کی کوٹھڑی نمبر ۸ میں قید رہا۔ پھر تیسرے کیمپ کی ۳۰ نمبر کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بلاک نسبتاً لطف اندوز اس لیے تھا کہ یہاں سے دریا نظر آتا تھا جو صرف ۵۰ میٹر دور تھا، کشتیاں بھی نظر آجاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد انفرادی کوٹھڑی لے جایا گیا۔ میں زیادہ تر وہاں رہا۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف پندرہ منٹ واک کی اجازت ملتی۔ اس دوران بھی ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے۔ بہت عرصے تک ناخن کاٹنے اور سر کے بال مونڈھنے کی مشین کا بندوبست نہ تھا، کھانا بہت کم ملتا تھا، کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ پورا مہینہ ایک مرتبہ بھی پیٹ بھر کے کھانا نصیب نہ ہوتا۔ بھوکا رکھنے کی وجہ سے اکثر قیدی بیمار رہتے، کھانا فوجی تقسیم کرتے تھے اور اس تقسیم کا کوئی قانونی اندازہ نہیں تھا۔ پلاسٹک کے لفافوں اور برتنوں میں خوراک تقسیم ہوتی تھی۔ ڈسپوزایبل برتن واپس لے لیے جاتے اور تلف کرنے کی بجائے انہی برتنوں میں دوبارہ کھانا دیا جاتا۔ خوراک میں مچھلی، مرغی، گوشت، بھنڈی، لوبیا، گوبھی، آلو، چاول اور انڈے ملتے تھے۔ روٹی چار قسم کی ہوتی۔ کھانا باری باری پکتا تھا، سبزی ابلی ہوئی ملتی اور سالن اکثر ٹھنڈا ہوتا جس کی وجہ سے قیدیوں کو قبض کی شکایت رہتی تھی۔ مچھلی بدبودار ہوتی اور مرغی کے گوشت میں خون صاف نظر آتا، چاول اتنے کم ہوتے کہ نصیب اللہ نامی ہمارے ایک ساتھی ایک نوالہ بھر کر کھا لیتے تھے۔ روٹی اتنی کم مقدار میں ملتی کہ بچے کا پیٹ بھی اس سے نہ بھر سکتا تھا۔ تاہم دن کو تین قسم کا فروٹ بھی دیا جاتا جبکہ ناشتے میں ایک گلاس دودھ دیا جاتا جو روٹی کی کمی پوری کر دیتا تھا۔ متعصب فوجیوں کی ڈیوٹی ہوتی تو فروٹ اور دودھ نہ ملتا اور نماز باجماعت پڑھنے پر بھی پابندی لگ جاتی۔ بند کوٹھڑیوں میں قیدیوں کو نماز کے اوقات کا پتا نہ چلتا۔ اس لیے ہر قیدی اپنے اندازے کے مطابق نماز پڑھتا، نسبتاً کھلے قید خانوں سے اذان کی آواز آتی تو امریکی فوجی ہوا میں مکا لہرا کر نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ ڈیلٹا کا تیسرا کیمپ بننے سے مشکلات بڑھ گئیں، کھانا کم کر دیا گیا اور قیدیوں کی حالت مزید خراب ہوگئی، سزا میں مزید سختی لائی گئی۔ کیوبک کے نام سے نیا کیمپ قائم کیا گیا جہاں سخت سردی میں قیدیوں کو صرف ایک نیکر میں رکھا جاتا۔ یہ قیدی لوہے کی ٹھنڈی چادر پر سوتے اور نماز بھی نیکر میں ہی پڑھتے۔ سخت سردی کی وجہ سے اکثر قیدی بیٹھ کر سوتے تھے۔ بیت الخلاء بھی کھلا تھا اور پردے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بدن کی گرمائش کے لیے قیدی اکثر چھلانگیں لگاتے تھے یعنی ایک جگہ کھڑے ہو کر جمپنگ کیا کرتے تھے۔ واش روم میں ٹائلٹ پیپر ہوتا نہ پانی۔ اس لیے اکثر قیدی پینے کا پانی اپنی صفائی کے لیے رکھ دیتے اور پانی اس لیے بھی کم پیتے تاکہ پیشاب نہ آئے۔ اسی وجہ سے روٹی بھی کم کھاتے تاکہ لیٹرین کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس کیمپ میں پلیٹ کی بجائے ہاتھ میں کھانا دیا جاتا تھا۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں سے اسی سلوک کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ مجھے اس کیمپ میں کم از کم ایک مہینہ رکھا گیا۔ جو قیدی فوجیوں کے ساتھ الجھتے، ان کی قید میں پانچ مہینے تک توسیع کر دی جاتی تھی۔

گوانتاناموبے میں ایک بلاک پاگلوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ جس میں تنگ آکر بعض قیدی خودکشی کر لیتے۔ خودکشی کے واقعات بڑھ گئے تو قیدیوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جانے لگا اور نشہ آور چیز کھلا کر یا انجکشن لگا کر ان کو بے یارومددگار چھوڑ دیا جاتا۔

بعد میں دو مزید کیمپ بن گئے۔ ایک بہت سخت تھا۔ جبکہ دوسرے میں زندگی نسبتاً آسان تھی۔ ایک کو 4 th

Camp کا نام دیا گیا اور آخری کو 5th Camp کہا گیا۔ آخری کیمپ میں بہت سختیاں تھیں۔ یہاں زندگی گزارنے کے لیے پہاڑ جتنے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اکثر قیدیوں کو اس کیمپ سے یا تو منتقل کر دیا جاتا یا پھر رہا کر دیا جاتا۔ ایک فوجی کی میرے ساتھ گپ شپ تھی' اس نے بھی مجھ سے یہ بات چھپائی کہ ان قیدیوں کو کہاں منتقل کیا جاتا ہے۔ جو بھائی پانچویں کیمپ سے واپس لایا جاتا تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہوتا۔ ہم اس کی شکل سے ڈرتے۔ اس کیمپ کو قیدی ''پانچویں قبر'' کہتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ بوسنیا کے شیخ جابر سے پوچھا کہ آپ کس کیمپ میں ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا ''میں زندگی کی قبر میں ہوں''۔ چوتھا کیمپ اس لیے بنایا گیا تھا تاکہ جن قیدیوں کو رہا جاتا ہے کو یہاں رکھ کر ان کی صحت بحال کی جاسکے۔ شاید اسی مقصد کے لیے قیدیوں کو پورا کھانا اور وافر مقدار میں فروٹ دیا جاتا۔ اس کیمپ میں ۲۰۰ افراد کی گنجائش تھی اور فوجیوں کا سلوک ٹھیک تھا۔ یہاں ہر کمرہ دس افراد کے لیے تھا۔ بلاکوں کے سامنے کھانے اور واک کرنے کی بڑی جگہیں تھیں۔ باجماعت نماز پڑھنے اور ورزش کرنے کی یہاں اجازت تھی۔ ہر کمرے میں دو دو پنکھے لگے ہوتے۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار نمائشی فلم بھی دکھائی جاتی۔ اکثر قیدی فلم دکھانے اور دیکھنے کی مخالفت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو ایک عرب بھائی نے ٹی وی توڑ دیا تھا۔ ایک سکول بھی کھولا گیا تھا اور اس سکول کے بعض طلباء کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ تھی۔ طبی چیک اپ کا نظام بھی اچھا تھا۔ فٹ بال، والی بال اور بیڈمنٹن کھیلنے کی اجازت تھی۔ جب کوئی وفد آتا تو کھیلوں کی سرگرمیاں منسوخ ہو جاتیں۔ وفد کے لوگ آتے ہماری اور کمروں کی تصاویر بناتے، ہمیں ان سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ان میں اکثر امریکی سینیٹرز، صحافی اور سیاح ہوتے۔ اس کیمپ کا یونیفارم سفید رنگ کا تھا۔ زیر جامہ اور بنیان بھی دی جاتی۔ یونیفارم کے تین جوڑے دیئے جاتے، جنہیں خود دھونے کی اجازت تھی۔ صابن اور شیمپو بھی دیا جاتا تھا۔ کوئی قیدی کیمپ کے ابتدائی حصے میں منتقل ہو جاتا تو اس کی رہائی کی بات پھیل جاتی۔ ہمیں بھی یقین ہوتا کہ اب اس کو رہا کر دیا جائے گا اور امریکی بھی کہتے کہ کیمپ کے اس حصے میں ایک مہینے سے زیادہ کسی کو قید نہیں رکھا جاتا اور اس کے بعد اس کو رہا کر دیا جاتا ہے۔ مگر بعض

جب ہماری داڑھیاں مونڈ دی گئیں

ایک دن صبح سویرے ہم خیمے کے اندر بیٹھے تھے کہ کئی فوجیوں نے آکر قیدیوں کو زنجیریں اور بیڑیاں ڈالنی شروع کر دیں۔ پھر دس دس کر کے قیدیوں کو باہر لے جانا شروع کر دیا۔ ساتھیوں نے طرح طرح کے تبصرے شروع کر دیئے۔ کوئی کہتا کہ دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے، کسی کا تبصرہ تھا کہ سب کو رہا کیا جا رہا ہے۔ غرض' جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ کچھ دیر بعد پہلے والے دس قیدیوں کو واپس لایا گیا تو ان کی داڑھیاں، مونچھیں اور ابرو تک کے بال صاف کر دیئے گئے تھے۔ میری باری آئی اور مجھے نائی کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ میں نے بہت منتیں کیں اور کئی بار مزاحمت کے لیے سر کو ہلایا مگر چہرے پر اتنا سخت تھپڑ پڑا کہ پانچ منٹ تک آنکھوں پر اندھیرا چھایا رہا۔ اس واقعے سے مجھے ایک دوسرا تھپڑ بھی یاد آیا جو ایک ڈاکٹر نے مجھے مارا تھا۔ ایک بار معائنہ کراتے وقت آنکھوں کے ڈاکٹر کو استفسار پر وجہ بتائی تو اس نے تھپڑ رسید کر دیا اور کہا کہ شکایت کیوں کرتے ہو۔ ہم اس وجہ سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یمنی مجاہد شیخ صالح کی بہت لمبی اور گھنی داڑھی تھی۔ ان کی داڑھی مونڈھی گئی تو وہ بہت رویا تھا مگر جب داڑھی صاف ہونے پر' میں نے رونا شروع کیا تو مجھے تسلیاں دیتا رہا کہ اسی میں اللہ کی رضا ہوگی۔ ہمارا غیرت مند رب اس کا صلہ ضرور عطا کرے گا۔ میں اس بات پر مطمئن ہو گیا کہ میرا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

اوقات یہ ایک مہینہ برسوں میں تبدیل ہوجاتا۔امریکیوں کی یہ وعدہ خلافی اور جھوٹ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر بلاک کے دروازے پر قواعد وضوابط یا ہدایت نامے درج ہوتے تھے۔ان میں لکھا ہوتا کہ ہماری اطاعت کروگے تو زندگی آسان ہوگی، امتیازی سلوک آپ کا حق نہیں مگر اطاعت کرنے والوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاسکتا ہے۔بصورت دیگر مزید سختیوں کے لیے تیار رہو۔

افغانستان کا وفد:

ایک دن مجھے اکیلے تفتیش کے نام پر اسی جگہ لے جا کر باندھا گیا جو میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔میں کسی تفتیش کار کا انتظار کرنے لگا مگر دیکھا کہ چند افغان باشندے آئے، سلام کیا اور ادھر ادھر پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔انہوں نے اپنا تعارف افغان حکومت کے نمائندوں کے طور پر کرایا، ان میں قندھار اور جلال آباد سے تعلق رکھنے والے دو پختون، باقی پنج شیری تھے۔قندھار نے پانی کا گلاس دیا پھر سوالات پوچھنا شروع کردیئے۔سوالات وہی تھے جو امریکی پوچھتے تھے جبکہ میرے جوابات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔اس دوران ایک امریکی عورت آئی جو بار بار ان افراد کے کان میں سرگوشی کرتی اور ان کو کچھ لکھا ہوا دیتی، میں نے حقیقت جاننا چاہی اور ان سے پوچھا کہ آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کی رہائی چاہتے ہیں۔میں نے کہا کہ آپ کا عمل اور رویہ یہ نہیں ثابت کرتا کہ آپ میری رہائی چاہتے ہیں۔جواباً وہ سب خاموش رہے۔میں بھی سمجھ گیا کہ وہ بے بس ہیں کیونکہ بات کرتے وقت بھی وہ چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے۔میں نے ان پر یہ اعتماد بھی نہیں کیا کہ یہ ہمارے ملک کے حکومتی نمائندے ہوں گے کیونکہ ان کی صلاحیتیں انتہائی کم معلوم ہوتی تھیں۔ان کے بارے میں دوسرے قیدیوں کے بھی میری طرح کے تاثرات تھے۔بعض قیدی تو ان کے سوالوں کا جواب گالیوں کی صورت میں دیتے تھے۔وہ تفتیش میں امریکیوں سے بھی سخت تھے اور خود کو لاعلم ظاہر کرتے تھے۔چونکہ امریکیوں کے لیے کام کرتے تھے اس لیے قیدی بھی ان کے ساتھ نرمی نہیں برتتے تھے۔چند دن بعد ۱۶ر جون ۲۰۰۴ء کو مجھے واپس چوتھے کیمپ منتقل کردیا گیا جہاں مجھے ایک سال اور چند مہینے رکھا گیا۔

چشم دید واقعات:

مجھے تین سال چھے مہینے تک مختلف کیمپوں اور قید خانوں میں رکھا گیا۔اس دوران ایسے ایسے واقعات دیکھے جو ہلا دینے والے تھے اور جنہیں اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونا آجاتا ہے۔امریکی فوجی قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے تھے، وہ مسلمہ انسانی وبین الاقوامی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔۲۰۰۳ء میں رمضان المبارک میں دو دن باقی تھے، امریکی آئے اور کہا رمضان المبارک کے احترام میں آپ کو دگنا کھانا دیا جائے گا۔افطاری کے وقت جوس اور کھجوریں بھی دی جائیں گی۔یہ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات تھی مگر ان کی یہ بات اعلانات تک محدود رہی۔صبح ہوئی تو ان کا سلوک اور بھی برا ہوگیا۔بلاک کے آخری حصے میں تین قیدیوں نے فوجیوں کے ساتھ لڑائی کی۔ایک قیدی نے فوجی پر پانی ڈالا۔اس کی سزا پورے کیمپ کے قیدیوں کو رمضان پیکج واپس لے کر دی گئی اور فوجیوں نے مزید وحشیانہ سلوک شروع کردیا۔ہم نے بارہا امریکی فوجی افسروں سے کہا کہ صرف اس شخص کی سزا پورے کیمپ کے قیدیوں کو کیوں دی جارہی ہے؟ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور رمضان المبارک کا احترام ممکن بنائیں۔جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم فوجی ہیں اور ہمارا قانون یہ ہے کہ ایک آدمی کی سزا سب کو دیتے ہیں۔یہ ایسا جھوٹ تھا جسے ہم خوف کے مارے جھوٹ نہیں کہہ سکتے تھے۔ایک مرتبہ ایک بدشکل خاتون فوجی نے

قیدیوں کی تلاشی کے دوران قصداً دومرتبہ قرآن مجید کو زمین پر پھینکا۔قیدیوں نے اس بے حرمتی پر خاتون فوجی کو سزا دینے کا مطالبہ کیا مگر امریکہ کی فوجی حکام نے اس مطالبے پر کان نہیں دھرا۔ پہلے کیمپ کے قیدیوں نے اس ظلم پر ہڑتال شروع کر دی جس کا دوسرے اور تیسرے کیمپ کے قیدیوں نے بھی ساتھ دیا۔قیدوں نے نہانے کی جگہ جانے، کپڑے بدلنے اور کھیل وتفریح کے اوقات میں باہر نکلنے کا بائیکاٹ کر دیا جس پر بارہ امریکی فوجیوں نے قیدیوں پر یلغار کر دی۔وہ قیدیوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی مونچھیں ،داڑھی اور ابرو صاف کر دیتے، کسی کی آدھی داڑھی چھوڑ دیتے اور کسی کی ایک مونچھ۔اس ظلم وزیادتی پر باقی قیدی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے جبکہ بعض فوجیوں کو گالیوں اور بددعاؤں سے نوازتے۔اس دوران افواہ آئی کہ امریکی فوجیوں نے سعودی عرب کے مشعل نامی قیدی کو اس قدر تشدد کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے جامِ شہادت نوش کر لیا ہے۔اس افواہ سے حالات مزید سنگین ہو گئے۔اب فوجی بڑے بڑے مضبوط ڈنڈے اٹھائے پھرتے تھے۔ایسی گاڑیوں کا گشت مختلف کیمپوں میں شروع ہوا جن پر توپیں اور مشین گنیں نصب تھیں، عصر کا وقت تھا جب عربی، انگریزی اور اردو میں اعلان ہوا کہ مشعل کی حالت نازک ہے،ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔اس اعلان سے قیدی بھی خاموش ہو گئے اور اس تجسس میں مبتلا ہو گئے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟اور پھر ہمارے ہم خیال ایک قیدی جو ہسپتال سے آیا تھا' نے بتایا کہ انہوں نے مشعل کو دیکھا ہے،اس کی حالت واقعی خراب ہے اور پھر دو تین مہینے بعد پتا چلا کہ مشعل پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے اور اس کے تمام اعضاء شل ہو گئے ہیں۔امریکی فوجیوں نے مشعل کو تشدد کا نشانہ کیوں بنایا تھا' اس کا ہمیں آخر تک پتا نہ چل سکا۔مشعل نے دو سال چھے مہینے ہسپتال میں گزارے۔اس کو وہیل چیئر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔اتنا معذور تھا کہ بغیر سہارے کے نہ کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ بیٹھ سکتا تھا۔آخر میں اسے سعودی حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔

پہلے پہل ہر کیمپ میں کھانے اور پھل وغیرہ کی اچھی خاصی مقدار ملتی تھی۔پھر ہر کیمپ کے انچارج نے عجیب رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ہوا یوں کہ ایک فوجی بار بار ہر قیدی کے پاس جاتا اور کھانے کے مینو، پسند وناپسند اور کمی بیشی کے بارے پوچھتا اور ایک نوٹ بک میں تحریر کرتا جاتا۔نتیجہ اس عجیب کام کا یہ نکلا کہ کھانے پینے کی جو چیز قیدیوں کو پسند نہیں تھی' اس کی مقدار بڑھائی گئی اور جس چیز کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا گیا' اس کی مقدار کم کر دی گئی۔خوراک کی اچھی چیزیں غائب ہو گئیں جبکہ ناکارہ اشیائے خورونوش میں اضافہ کر دیا گیا۔وقت کے ساتھ مشکلات بڑھتی گئیں۔آغاز میں تفتیش یا ریڈ کراس والوں سے ملنے یا ڈاکٹر کے پاس لے جاتے وقت ایک پٹے سے باندھا جاتا جو بعد میں زنجیر میں تبدیل ہو گیا اور پھر زنجیر سے پاؤں اور ہاتھوں کو بھی باندھا جانے لگا۔ہتھکڑی ایک کی بجائے تین تین پہنائی جانے لگیں۔پہلے آنکھیں بند نہ کی جاتی تھیں۔پانچویں کیمپ میں آنکھوں پر پٹی باندھنا اور کانوں میں روئی ٹھونسنا عام سی بات بن گئی تھی۔پہلے مذہبی کتابوں پر کوئی پابندی نہیں تھی جو بعد میں عائد کر دی گئی۔اقتصادیات، ریاضی، بیالوجی، سیاست، تاریخ اور جغرافیہ کے موضوع پر مبنی کتابیں بھی بند کر دی گئیں۔نیند پوری نہ لینے دی جاتی تھی۔ملا اخوند کو ۴۰ دن اور رات تک نیند نہ کرنے دی گئی۔اس کو سخت سردی میں بھی ائر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھا گیا۔فوجی گھی کے خالی کنستر بجاتے تاکہ قیدسو نہ سکیں۔قیدیوں خصوصاً عرب قیدیوں کو موٹر لانچ میں بٹھا کر فل سپیڈ کے ساتھ چلائی جاتی۔رفتہ رفتہ علاج کی سہولتیں کم ہوتی گئیں۔ڈاکٹر ابتدائی مراحل میں آزاد تھے اور مریض قیدیوں کو دوائیاں بھی دیتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان پر بھی پابندی عائد ہو گئی اور قیدیوں پر توجہ بالکل نہ دی جاتی۔

خون کے کینسر میں مبتلا قندھار کے ولی محمد نامی قیدی کی تکلیف سے چیخیں نکل جاتیں مگر اس کے پاس کسی معالج کو نہیں بھیجا گیا ۔نتیجتاً اس کا سارا جسم سوج گیا۔ہم مجبور ہو گئے کہ اس کے لیے احتجاج شروع کریں۔ہم نے زور زور سے نعرہ تکبیر بلند کرنا شروع کر دیا اور قید خانے کی آہنی دیواروں کو مار مار کر شور مچانا شروع کر دیا جس سے فوجیوں کے اوسان خطا ہو گئے ۔فوجیوں نے اپنے افسروں کو بلایا، ترجمان کو لایا گیا پھر جا کر مریض کو کلینک لے جایا گیا جہاں اس کے مرض (بلڈ کینسر) کی تشخیص کی گئی ۔کینسر نے اس کے جگر کو بھی متاثر کیا تھا۔اگر ولی محمد کا بروقت علاج ہوتا تو اس کا مرض اتنا نہ بڑھتا۔ ہم کبھی کبھار جینوا کنونشن کے تحت اپنے حقوق یاد دلاتے تو امریکی فوجی کہتے کہ جنیوا جا کر اپنے حقوق حاصل کرلو، یہ امریکہ ہے ۔ہم سے تفتیش کے دوران کوئی با مقصد جواب نہ پاتا اور تشدد کر کے تھک جاتے تو آخر میں خود اپنے صدر بش کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ۔کبھی میڈیا کے لوگ یا حکومتی عہدیدار تماشا دیکھنے آتے تو سارے کیمپوں کا معائنہ کرانے کی بجائے ان کو صرف 4th Camp کا دورہ کرایا جاتا کیونکہ اس کیمپ کے حالات اچھے تھے۔ایسے وفود کو دکھانے کے لیے نمائشی جگہیں بنائی گئی تھیں ۔اکثر مریضوں کو دورے کے اوقات میں نشہ دیا جاتا تھا تا کہ وہ سوتے رہیں اور امریکی وحشیانہ سلوک کا بھانڈا نہ پھوڑ سکیں ۔ایک مرتبہ چوتھے کیمپ کے دو قیدیوں نے ایک وفد کے ارکان کو بتایا کہ یہ نمائشی کیمپ ہے۔آپ اگر حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو پہلے ،دوسرے ،تیسرے ،پانچویں اور ایکو کیمپ کے قیدیوں اور مریضوں کا حال دیکھیں ۔انہوں نے کہا کہ ہم انصاف چاہتے ہیں ،ہم دہشت گرد نہیں ہیں ۔ہمیں عدالت میں پیش کیا جائے تا کہ پتا لگے کہ کتنے بے گناہوں کو دہشت گردی کے کھاتے میں سخت ترین عذاب سے گزارا جا رہا ہے۔امریکی فوج نے بعد میں شکایت کرنے والے بیس افراد کو سزا کا مستحق قرار دے کر ان کو چوتھے کیمپ سے باہر نکالا اور ساری مراعات اور سہولیات واپس لے لیں۔

جھوٹ معلوم کرنے کی مشین

ایک بار مجھے تفتیش کے لیے لے جا کر کمرے میں سفید کرسی پر بٹھایا گیا اور خلافِ معمول ہاتھ پاؤں کھولے گئے ۔ایک چمکیلی آنکھوں والے چالاک امریکی نے ایک سفید ریش فارسی بولنے والے ترجمان کے ذریعے بتایا کہ (اشارہ کر کے) یہ مشین جھوٹ معلوم کرتی ہے اس کو Lie Detector Machine کہتے ہیں۔ یہ مشین آپ کے سچ اور جھوٹ کا پتا لگائے گی۔پھر مجھے اس مشین پر بٹھایا گیا۔میں نے کہا کہ یہ مشین پہلے کہاں تھی؟ آپ نے ساڑھے تین سال عذاب سے دوچار کیے رکھا۔اگر یہ مشین پہلے استعمال ہو جاتی تو آپ کو سچ جھوٹ کا پتا چل جاتا۔اس نے پہلا سوال پوچھا:

آپ کو کون بہتر جانتا ہے؟

میں نے جواب دیا کہ میرا خالق۔

پھر پوچھا اس کے بعد؟

میں نے کہا کہ کوئی دوسرا میرے دل کا حال نہیں جانتا۔

اس نے کہا کہ میں جان گیا ہوں ۔مشین ایسی تھی کہ دل کی دھڑکنوں اور فشارِ خون کے ذریعے سکرین پر گراف کی طرز پر کچھ دکھاتی اور جب کوئی جھوٹ بولتا تو ظاہر ہے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی پھر یہ امریکی اس پر شک کرتے ۔جب میں نے کہا کہ مجھے کوئی اور نہیں صرف میرا خدا بہتر جانتا ہے تو وہ کہتا کہ ہم خدا سے بہتر تمہیں جانتے ہیں ۔میں نے کہا کہ کہیں خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھو۔اس نے پوچھا کہ کبھی خدا کی نافرمانی کی ہے؟

میں نے کہا ہاں کی ہے۔

اس مشین کے سامنے کوئی حوصلے سے بات کرتا تو کامیاب ہو جاتا کوئی گھبرا کر سچ بھی بولتا تو امریکی سکرین دیکھ کر اس پر شک کرتے۔

گوانتاناموبے میں بوسنیا سے تعلق رکھنے والے شیخ جابر، ابوشیما محمد، مصطفیٰ اور الحاج بھی قید تھے جو بہت ہی مظلوم تھے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ گوانتاناموبے کیوں لایا گیا ہے اور ان کا جرم کیا ہے؟ ابوشیما کو تو سزا کے لیے پانچویں کیمپ بھی لے جایا گیا۔ شیخ جابر نے مجھے بتایا کہ ہم نے ہر تفتیش کار سے اپنا قصور پوچھا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ بعض کہتے کہ آپ امریکی مفادات کے لیے خطرہ ہیں۔ ہم ثبوت مانگتے تو کہتے کہ ثبوت ضروری نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ نے ماضی میں کچھ کیا ہو۔ ہوسکتا ہے آپ مستقبل میں امریکی تنصیبات پر حملہ کریں اور امریکیوں کو نقصان پہنچائیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان پانچوں بوسنیائی بھائیوں نے زندگی میں نہ کبھی افغانستان دیکھا تھا اور نہ کسی تنظیم سے ان کا تعلق تھا۔ ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے سربوں کے خلاف جہاد لڑا تھا۔

میں نے بحیثیت افغان سفیر کئی بار اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیموں سے رابطہ کیا تھا کہ افغانستان میں طالبان قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا نوٹس لیا جائے اور بے گناہ افراد کو رہا کیا جائے۔ مجھے ہر بار یقین دہانیاں کرائی گئیں۔ اپنی گرفتاری سے قبل حامد کرزئی اور جنرل پرویز مشرف دونوں سے مسلسل رابطہ رکھا اور ان سے مطالبہ کیا کہ افغانستان کے شمال میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان کو رہا کیا جائے اور ان سے وحشی سلوک روکا جائے مگر دونوں بے بس نظر آتے تھے۔ غسان جو عرب تھا' نے بتایا کہ میں اپنے چند ساتھیوں سمیت لاہور کے ایک ہوٹل میں کرائے کے عوض کمرہ لے کر اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ کسی طریقے سے پاکستان سے باہر نکل سکوں۔ پاکستان سے باہر جانا آسان تھا مگر اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھی۔ باہر بھجوانے کا کام پاکستانی اہلکار باقاعدہ مک مکا کر کے کرتے تھے۔ جب سودا طے نہ ہوا تو انہی اہلکاروں نے چھاپہ مار کر گرفتار کر لیا۔ انہوں نے جب چھاپہ مارا تو ہمارے پاس سبزی کاٹنے والی چھریاں تھیں جبکہ ان کے پاس بھاری اسلحہ تھا۔ اس کے باوجود ہم نے خوب مزاحمت کی۔ ہماری مزاحمت دیکھ کر اہلکاروں نے کہا کہ ہم آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ نہیں آپ کے ساتھ امریکی ہیں اور ہم خود کو امریکہ کے حوالے نہیں کریں گے۔ اہلکاروں نے کہا کہ آپ کو امریکہ کے حوالے کرنے نہیں بلکہ پوچھ گچھ کرنے کے لیے گرفتار کیا جا رہا ہے۔ ہم نے خدا اور رسول (ﷺ) کے واسطے دیئے اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور عرب مجاہدین ہیں مگر وہ نہیں مانے۔ محاصرہ کر کے جب انہوں نے ہمیں گرفتار کر لیا تو با اثر دکھائی دینے والے چند افراد آئے اور قسم اٹھا کر کہا کہ ہم لشکر طیبہ کے لوگ ہیں اور آپ کے ساتھی ہیں۔ آپ مزاحمت نہ کریں۔ پھر ان پاکستانی اہلکاروں نے پہلے ہمیں لوٹا اور پھر امریکی فوجیوں کو لایا گیا کہ آئیں دیکھیں ہم کس طرح آپ کے لیے مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں۔ دو اور افراد جو مصنفین تھے اور جلال آباد سے ان کا بنیادی تعلق تھا، پاکستان میں اپنے ذاتی مکانات میں رہائش پذیر تھے۔ ان میں ایک دینی کتابوں کے مصنف عبدالرحیم مسلم دوست اور دوسرے انگریزی زبان کے استاد بدرالزمان بدر تھے۔ پاکستانی اہلکاروں نے ان دونوں افغان مہاجروں کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں کا طالبان سے کوئی واسطہ نہ تھا، یہ دونوں تین مہینے تک ایک پاکستانی ادارے کی تحویل میں رہے پھر ان کو امریکی تحویل میں دے دیا گیا۔ ان دونوں کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ظلم نہیں دیکھ سکتے تھے اور پاکستان پر تنقید کرتے تھے۔ جاری ہے